Date of Publication : 23-11-2014

PRICE Rs. 3/-

POSTED AT N.D.P.S.O, New Delhi-01
ON 24-25 Nov. 2014 R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without PrepaymentU (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

1-7 December 2014
Issue: 45, Vol.:73

یکم تا ۷ دسمبر ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۴۵، جلد نمبر: ۷۳

اردو کے ممتاز ادیب، صحافی اور رسالہ ’ہندستانی‘ کے اڈیٹر سہیل عظیم آبادی (مرحوم) کی یہ تحریر ’زمانہ‘ اپریل 1939 کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ چوں کہ یہ تحریر ایک اہم موضوع کو محیط ہے اس لیے، اسے ہم ’گاہے گاہے باز خواں‘ کے طور پر یہاں نقل کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

گاہے گاہے باز خواں

پہلی قسط

ہندستانی زبان کا مسئلہ

سہیل عظیم آبادی

فروری میں دہلی براڈ کاسٹنگ اسٹیشن سے چند بزرگوں نے ہندستانی زبان کے متعلق اپنے خیالوں کو براڈ کاسٹ کیا تھا۔ یہ تقریریں اس لیے اور بھی اہم تھیں کہ ان میں سے چار حضرات بہار گورنمنٹ کی بنائی ہوئی ہندستانی کمیٹی کے ممبر ہیں۔ ان کے سپرد جو کام کیا گیا ہے وہ ’ممکن‘ ہے کہ زبان کے معاملے میں سارے ہندستان کی رہنمائی کر سکے (کیوں کہ ہندستانی زبان میں اسکولی کتابوں کے لکھوانے کا کام بھی اسی کمیٹی کے سپرد کیا گیا ہے)۔

جن لوگوں نے ان تقریروں کو سنا ہے انھیں اس کا اندازہ ہوگا کہ یہ تقریریں کتنی مایوس کرنے والی تھیں۔ ان تقریروں سے دراصل جو بات صاف طور سے معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ زبان کے معاملے میں ہمارے بزرگوں کا نظریہ بہت ہی الجھا ہوا ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں کسی کی تقریر کو ٹھیک طور سے نقل کرنا غیر ممکن ہے، اس لیے ان تقریروں سے جو نتیجے میں نکال سکا ہوں انھی کو یہاں پر لکھتا ہوں۔

ڈاکٹر عبدالحق کی تقریر سے یہ بات صاف طور سے معلوم ہوگئی کہ وہ زبان کے معاملے میں کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے پر آمادہ نہیں، البتہ اگر اردو کو ’ہندستانی‘ مان لیا جائے تو وہ طوعاً کرہاً اس نام کو منظور کرلیں گے لیکن زبان کی شکل صورت اور روپ ریکھا میں کسی قسم کی تبدیلی کو گوارا نہ کریں گے، ’ہندستانی‘ میں وہ ہندی کا کوئی لفظ بھی جو اردو ادب میں پہلے سے موجود نہیں ہے، داخل کرنا نہیں چاہتے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ’ہندستانی‘ کا نام انگریزوں کا دیا ہوا ہے، اس سے پہلے اس زبان کا نام اردو، ریختہ اور ہندی تھا، اب ’ہندستانی‘ نام اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کا دیا ہوا نام اختیار کیا جائے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس حقیقت کو بھلا دیا کہ اردو اور ہندی کی موجودہ صورت کی ابتدا بھی ’ہندستانی‘ نام کے ساتھ ہی فورٹ ولیم کالج میں ہوئی تھی۔ اگر جان گلکرسٹ رسم خط کی تلوار سے ایک زبان کے دو ٹکڑے نہ کر دیتے تو آج نہ اردو ہندی کی یہ شکل ہوتی اور نہ یہ جھگڑا پیدا ہو سکتا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب جان گلکرسٹ کی ’بنائی‘ ہوئی یا ترقی دی ہوئی زبان کو گلے کا ہار بنائے ہوئے ہیں مگر اس کا دیا ہوا نام انھیں نہیں بھاتا۔

اس کے ساتھ ہی جہاں انھوں نے گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کے خلاف کوششیں کی ہیں وہاں جان گلکرسٹ کو بھی کچھ نہیں کہا۔

بہر حال ڈاکٹر عبدالحق نے جرأت کے ساتھ غیر مصالحانہ رویہ اختیار کیا ہے جس سے ہمیں کوئی شکایت نہیں اور ہم اس پر کوئی بحث بھی نہیں کرنا چاہتے۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحبان نے گاندھی جی کے نظریے کی تائید کی ہے اور یہی کہا ہے کہ ’ہندستانی‘ جب مدراس، بنگال یا بمبئی کے لیے لکھی جائے گی تو اس کا رجحان سنسکرت کی طرف ہوگا اور جب پنجاب اور سرحد کے لیے لکھی جائے گی تو اس کا رجحان فارسی عربی کی طرف ہوگا تاکہ وہاں کے رہنے والے اسے آسانی سے سمجھ لیں۔

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندستانی زبان کی دو صورتیں ہوں گی:

(۱) وہ ہندستانی جس پر سنسکرت کا اثر زیادہ ہو۔

(۲) وہ ہندستانی جس پر فارسی عربی کا اثر زیادہ ہو۔

ہاں اس سلسلے میں اتنا خیال ضرور رکھنا پڑے گا کہ زبان کو زیادہ سے زیادہ آسان اور عام فہم بنانے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اردو اور ہندی کا جھگڑا سرحد، پنجاب، بنگال، مدراس اور بمبئی سے زیادہ یو پی، بہار اور سی پی میں ہے، یعنی اسی ’انتر ویدی‘ میں جہاں کی زبان کو ہندستانی کا معیار قرار دیا گیا ہے، یہاں کیا ہوگا؟ کیا لکھنؤ اور بنارس یا دہلی اور الٰہ آباد کے ساتھ سرحد اور مدراس والی رعایت برتی جائے گی؟ اس انتر ویدی میں یہ جھگڑا کیسے طے ہوگا؟ اور انتر ویدی کی زبان کا معیار کیا رہے گا، اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

دوسرے پنجاب اور بنگال اور مدراس اور سرحد کے سلسلے میں بھی زبان پر عربی فارسی یا سنسکرت کے اثر کی رعایت دی گئی ہے، وہ بھی بے معنی معلوم ہوتی

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

ہم ہندستانی سیاسی آزادی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن ذہنی طور پر اب بھی روایتوں کے غلام ہیں۔ یہ گرہ اب تک ڈھیلی نہیں ہوئی بلکہ لگاتار جھٹکوں کی وجہ سے اور بھی سخت ہو گئی ہے۔ اول تو ہم کسی مسئلے پر آزادی کے ساتھ سوچ کر نتیجے پر پہنچنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ کچھ مفروضے اور مسلّمے اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں، اس کے بعد آزاد خیالی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے ہمارا سوچنا اقلیدس کا مسئلہ ثابت کرنے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ دماغ کا سارا زور ایک مفروضے کو ثابت کرنے میں ختم ہو جاتا ہے اور کسی صحیح نتیجے پر پہنچتے نہیں لیکن دل میں ضرور سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسی دلیلیں پیش کر دی ہیں جو ہمالہ سے بھی زیادہ اٹل ہیں۔ زبان کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہو رہا ہے، ہندی اور اردو کے حامی رسہ کشی کر رہے ہیں اور ایک کھینچ تان جاری ہے۔

باقر مہدی سے چند آدھی ادھوری ملاقاتیں

سلام بن رزاق (B-603، نیو آکار سی ایچ ایس، بالمقابل حیدری مسجد، نیا نگر، میرا روڈ (ایسٹ) تھانے-401107)
Email: sahirzahida@gmail.com

باقر صاحب سے میرے مراسم کیسے تھے؟ کتنے تھے؟ اور کیوں تھے؟ تھے بھی یا نہیں؟ یہ سب سوالات تشنہ ہیں۔ اگر میں ان کے جوابات دینے کی کوشش کروں تو شاید جوابات بھی تشنہ ہی رہیں گے۔

میری ناقص رائے میں دو افراد کے درمیان تعلقات بھی یکساں نہیں رہتے۔ وقت کے ساتھ ان کے مابین مختلف جذبوں کی لہریں ڈوبتی ابھرتی رہتی ہیں۔ محبت کی تہہ میں کہیں نہ کہیں سی نفرت بھی اکثر مارے بیٹھی رہتی ہے اور کبھی نفرت کے پردے میں محبت کا جذبہ پروان چڑھ رہا ہوتا ہے۔ ورنہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ برسہا برس کی دوستی کسی معمولی سی بات پر فوراً دشمنی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی ایک چھوٹا سا واقعہ برسوں کی دشمنی کو دوستی کے روپ میں بدل دیتا ہے۔ زندگی مجموعۂ اسرار ہے اور تمام انسانی رشتے اسی کے محور پر گردش کرتے ہیں۔ باقر مہدی نے زندگی کی اسی بوقلمونی کو اپنے مشہور شعر میں اس طرح پیش کیا ہے:

مجھے دشمن سے اپنے عشق سا ہے
میں تنہا آدمی کی دوستی ہوں

جنھوں نے باقر صاحب کو قریب سے دیکھا ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ شعر ان کی شخصیت کی پہچان بن گیا تھا۔ مشہور مزاح نگار جناب یوسف ناظم کے خاکے کا یہ بلیغ جملہ ان کی شخصیت پر کس قدر صادق آتا ہے:

''اگر سب لوگ پانی کی تلاش میں دریا کی طرف جا رہے ہوں اور صرف ایک شخص ریگستان کی سمت جا رہا ہو تو وہ تنہا شخص سوائے باقر مہدی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔''

اتفاق سے باقر مہدی نے خود بھی اس سے ملتی جلتی بات اپنے ایک شعر میں کہی ہے:

دو چار تھے جو توڑ کے صحرا نکل گئے
اک قافلہ سا دشت روایات ہی میں تھا

باقر صاحب سے ان کی بیگم خیرالنساء مہدی اور ان کے دوست تقی بھائی کے سوا کسی کے بھی تعلقات متوازن نہیں رہے۔ ٹائمز آف انڈیا کے اپنے ایک انٹرویو میں باقر مہدی نے کہا تھا کہ میرے واحد دوست تقی بھائی ہیں۔ ویسے ان کے مداحوں میں معروف شاعر یعقوب راہی کا نام سرفہرست ہے جو نہ صرف ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں بلکہ آخری لمحوں تک ان کی خبر گیری بھی کرتے رہے۔ میرے مراسم بھی دوسروں کی طرح ان سے ناہموار ہی رہے۔ کبھی اکثر ملے کبھی برسوں نہیں ملے۔ اس مختصر سے مضمون میں انھیں آدھی ادھوری ملاقاتوں کے دھندلے نقوش کو تازہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی تھی۔ تاریخ اور دن اب یاد نہیں، لیکن اتنا یاد ہے کہ یہ ملاقات مکتبہ جامعہ (بمبئی) کے دفتر میں ہوئی تھی۔ غالباً یہ ۶۸۔۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ مکتبہ جامعہ کے منیجر شاہد علی خاں صاحب نے انجمن ترقی اردو (ہند) کی بھیونڈی شاخ کے سکریٹری کی حیثیت سے میرا تعارف کرایا تھا۔ ظاہر ہے باقر صاحب کو انجمن ترقی اردو (ہند) سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ انھوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ صرف مصافحہ کر کے رہ گئے۔ میں ان دنوں بھنڈی بازار میں ایک ٹیوشن کرتا تھا۔ آتے جاتے کبھی مکتبہ جامعہ میں بھی جھانک لیتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں سنیچر کی شام کو شاعروں اور ادیبوں کا اچھا خاصا جمگھٹا رہتا تھا۔ باقر مہدی، ندا فاضلی، شہاب، ماہر کوٹلوی، فضیل جعفری، یوسف ناظم، محمود چھاپرا، زکریا شریف، انور خاں اور مرزا عزیز جاوید وغیرہ مستقل شرکا میں تھے۔ کبھی کبھی سردار جعفری، ع۔ انصاری، اختر الایمان، جاں نثار اختر، حافظ حیدر وغیرہ کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی تھی۔

میں بھی گاہے گاہے سنیچر کی اس محفل میں شریک ہونے لگا۔ اس وقت افسانہ نگاروں میں کرشن چندر اور شاعروں میں سردار جعفری میرے آئیڈیل تھے۔ ترقی پسند تحریک کی چمک دمک ماند پڑنے لگی تھی اور ادب میں جدیدیت کا بول بالا تھا۔ میں نیا نیا بھیونڈی سے بمبئی میں وارد ہوا تھا۔ بھیونڈی بمبئی سے ملحق ایک قصبہ ہے۔ وہاں کوئی ادبی ماحول نہیں تھا۔ میں نہ ترقی پسندی سے ٹھیک طرح واقف تھا نہ جدیدیت سے لہٰذا مکتبہ جامعہ کی بیٹھکوں میں ہونے والی باتیں اور بحثیں میرے لیے خاصی حیرت افزا ہوا کرتی تھیں۔ میں دیکھتا تھا کہ وہاں ہونے والے مباحث میں باقر مہدی پیش پیش رہتے تھے۔ گفتگو میں وہ اردو اور انگریزی ادب کے حوالوں کی ایسی جھڑی لگا دیتے کہ مقابل کو پسپا ہوتے ہی بنتی۔ اس پر مستزاد ان کے بے محابا قہقہے۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے پوچھ لیا: ''کہاں کہاں چھپتے ہو؟'' میں نے شاعر، شمع اور بلٹز کا نام لیا تو منہ پھیر لیا۔ مجھے سخت ندامت ہوئی۔

مکتبہ پر زیادہ تر 'شب خون'، 'آہنگ'، 'تحریک' اور 'کتاب' میں چھپنے والی تخلیقات پر بحثیں ہوتی تھیں۔ ان پرچوں میں جو افسانے چھپ رہے تھے خاص طور پر 'شب خون' میں وہ خالص جدید رنگ میں ڈوبے ہوتے تھے۔ سریندر پرکاش کے دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم، ڈپی واس، تلقارمس، بلراج مینرا کی کمپوزیشن سیریز، انور سجاد کی گائے، سنڈریلا، کونپل جیسے تجریدی افسانوں کا چرچا زیادہ تھا۔ نئے لکھنے والوں میں قمر احسن، شوکت حیات اور حمید سہروردی کا ذکر ہونے لگا تھا۔ بمبئی کے افسانہ نگاروں میں انور خاں اور انور قمر کا نام نمایاں تھا۔ انور خاں اپنا مشہور تجریدی افسانہ 'کوؤں سے ڈھکا آسمان' لکھ چکے تھے اور مکتبہ جامعہ کے شرکا میں نوجوان افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ میں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی لکھ رہا تھا۔ ہندی میں جدیدیت کی لہر اپنا کوئی خاص اثر چھوڑے بغیر معدوم ہو رہی تھی۔ وہاں تجریدی، علامتی اور استعاراتی کہانیوں کی جگہ سامنتر کہانی نے لے لی تھی۔ 'ساریکا' سامنتر کہانی کا ترجمان تھا۔ 'نئی کہانیاں'، 'کہانی'، 'کہانی کار'، 'دھرم یُگ' اور 'گیان ودے' جیسے ادبی پرچے کوئی لیبل لگائے بغیر خوبصورت کہانیاں شائع کر رہے تھے۔ میری کہانیاں مذکورہ رسائل میں تواتر سے چھپ رہی تھیں۔ شاید اسی لیے میرے افسانوں پر تجریدیت کا اثر اتنا گہرا نہیں تھا، جتنا میرے معاصرین پر تھا۔ میرے افسانے باقر صاحب کی نظر میں شاید اسی لیے بھی زیادہ معتبر نہیں تھے کہ وہ اس زمانے کے جدید افسانوں کی طرح علامت، استعارہ و تجریدیت اور ابہام کے زیوروں سے آراستہ نہیں تھے۔ انھی دنوں مکتبہ جامعہ کی سنیچری محفل کے شرکا نے باقر مہدی اور فضیل جعفری کی ادارت میں 'اظہار' نام سے ایک رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیا۔ ہر شخص نے اپنی استعداد کے مطابق چندہ دیا۔ 'اظہار' کی تیاری کے دوران حسب توقع باقر صاحب اور فضیل صاحب میں اختلاف ہو گیا۔ فضیل صاحب نے پہلے شمارے کے بعد ہی 'اظہار' سے علاحدگی اختیار کر لی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت کم مدت میں 'اظہار' نے ادبی صحافت میں اپنی ایک پہچان بنائی تھی مگر اپنی صحت کی خرابی اور مالی مشکلات کے سبب باقر صاحب نے پانچ شمارے نکالنے کے بعد 'اظہار' بند کر دیا۔

1975 میں ایمرجنسی نافذ ہوئی۔ میں باقاعدگی سے مکتبہ جانے لگا تھا۔ وہاں باقر صاحب سے تقریباً ہر سنیچر کو ملاقات ہو جاتی تھی۔ اب باقر صاحب سے قدرے بے تکلفی بھی ہو گئی تھی۔ مکتبہ سے اٹھنے کے بعد اکثر شام کو چوکڑی میں انھی کے مکان پر بیٹھک ہوتی تھی۔ کبھی ابراہیم نذیر (اظہار کے کاتب) بھی ان الف ناظم یا نشاط انور ساتھ ہوتے تھے۔ تازہ صورت حال کے علاوہ باقر صاحب ایمرجنسی کے دوران ہونے والی گرفتاریوں، پولیس کی زیادتیوں اور سنسر شپ کا ذکر کرتے اور ایمرجنسی کے خلاف سخت غم و غصے کا اظہار کرتے۔ اسی زمانے میں باقر صاحب کی ایک غزل اردو بلٹز میں چھپی تھی، جس کا مطلع تھا:

موسم دار و رسن آ پہنچا
پھر وہی دور کہن آ پہنچا

اگرچہ غزل میں ایمرجنسی کے خلاف کچھ نہیں تھا مگر موسم دار و رسن والے استعارے کے سبب باقر صاحب اس اندیشے میں مبتلا ہو گئے کہ شاید اس غزل کے بہانے پولیس ان سے باز پرس کر سکتی ہے۔ مجھے بھی کچھ کچھ اعتبار سا آنے لگا۔ حتیٰ کہ ایمرجنسی ختم ہو گئی اور کوئی باز پرس نہیں ہوئی۔ باقر صاحب ایمرجنسی کے خلاف باتیں تو کرتے تھے مگر اندر سے خوف زدہ بھی رہتے تھے۔ انھوں نے خود ایک جگہ اعتراف کیا ہے۔ ''میں سیاسی طور پر 'activist' بننا چاہتا تھا مگر نہیں بن سکا۔''

وہ 'activist' نہیں تھے مگر ان کے اندر 'activist' بننے کی تڑپ ضرور تھی۔ ہو سکتا ہے یہ خوف اسی کا نتیجہ رہا ہو۔ ان کا یہ شعر بھی غالباً اسی جذبے کی طرف اشارہ کرتا ہے:

ہم یوں ہی ٹیس بن کے بہت جی چکے مگر
یادِ حسین بن کے بھی مر جانا چاہیے

ایمرجنسی کے زمانے میں بیس نکاتی پروگرام سرکاری پالیسی کا ایک اہم ایجنڈا تھا۔ ذرائع ابلاغ اس پروگرام کی تشہیر کا ذریعہ تھے۔ ان دنوں میں ریڈیو کے لیے ڈرامے اور فیچر لکھا کرتا تھا۔ باقر صاحب کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ریڈیو پر لکھنا سرکاری پالیسی کی حمایت کرنے کے مترادف ہے۔ جب کہ میرے ڈراموں اور فیچروں میں ایسی

کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بہر حال میں ریڈیو کے لیے لکھتا رہا کیوں کہ وہ میری ضرورت تھی۔ آخر ایمرجنسی ختم ہوئی۔ کبھی نہ کبھی تو اسے ختم ہونا تھا۔ جوں ہی ایمرجنسی ختم ہوئی، پورے ملک کے طول و عرض میں ایمرجنسی کے خلاف جلسے جلوسوں کا جیسے سیلاب سا آگیا۔

باقر صاحب نے بھی 'اظہار' گروپ کے زیر اہتمام دادو بھائی فضل بھائی ہال میں ایمرجنسی کے خلاف جلسہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ جلسے کی تیاری میں، میں بھی ساتھ تھا لیکن جب جلسے میں پڑھنے اور بولنے والوں کی فہرست بنی تو اس میں میرا نام نہیں تھا۔ باقر صاحب نے میرا نام اس لیے شامل نہیں کیا کیوں کہ میں ایمرجنسی کے دوران ریڈیو پر لکھتا تھا۔ مجھے جلسے میں نہ پڑھوانے کا اتنا ملال نہیں تھا جتنا اس بات کا کہ محض ریڈیو پر لکھنے کی پاداش میں مجھے قابل تعزیر قرار دے دیا گیا۔ میں جلسے میں شریک نہیں ہوا۔ بعد میں، میں نے روزنامہ 'انقلاب' میں 'کاغذی سورما' کے عنوان سے ایک طنز لکھا۔

چوٹ سیدھی تھی۔ باقر صاحب کو خفا ہونا ہی تھا وہ خفا ہوگئے۔ چار چھ مہینوں تک مجھ سے بات نہیں کی۔ مکتبہ جامعہ پر مجھے دیکھتے ہی منہ پھیر لیتے تھے۔ ایک دن حیدرآباد کے ایک افسانہ نگار رشید انور آئے ہوئے تھے۔ شام کو دونوں 'مشغلے' کے لیے کریم لالہ کے اڈے پر جا رہے تھے۔ جاتے جاتے باقر صاحب اچانک میری طرف مڑے اور بولے۔ "تم نہیں چلوگے؟" میں تو گویا منتظر ہی تھا۔ فوراً ان کے ساتھ ہولیا۔ ان کی خفگی دور ہو چکی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ میرے افسانے پسند نہیں کرتے تھے مگر ان کے گھر کے دروازے میرے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ جیسا کہ ان کی عادت تھی، اکثر وہ ملنے والوں کو رخصت کرتے ہوئے کہا کرتے تھے "اب آپ سے ملاقات فلاں سال، یا فلاں مہینے میں ہوگی۔" مجھ سے بھی کہتے تھے۔ میں مسکرا کر جواب دیتا تھا: "ٹھیک ہے۔ مگر میری یادداشت ناقص ہے۔ بھول جاؤں تو معاف کر دیجیے گا۔"

ان سے ملتے ہوئے ہر بار ایک نئے تجربے کا سا احساس ہوتا تھا کیوں کہ ان کے تیز و طرار فقروں کی بوچھار اور بلند بانگ قہقہوں کی یلغار میں عجیب تھرل ہوتا تھا۔ جیسے آپ کسی ماہر شمشیر زن کے مقابل کھڑے ہوں ہر گھڑی چوکس اور مستعد۔

'آجکل' میں میرا ایک افسانہ 'انجام کار' چھپا جس کا پس منظر ممبئی کی ایک مجبور بستی قصائی واڑہ سے متعلق تھا۔ ان دنوں میں اسی محلے میں رہتا تھا۔ ہندی میں جب یہ افسانہ چھپا تو مجھے کئی دھمکی آمیز خطوط ملے مگر اردو میں کسی نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ حسب معمول باقر صاحب کو بھی افسانہ پسند نہیں آیا۔ بلکہ انھوں نے اس پر کئی طرح کے اعتراضات کیے۔ 1985 کے افسانہ سیمینار میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اسی افسانے کا سیر حاصل تجزیہ پیش کیا جو 'نیا اردو افسانہ' کے انتخاب میں شامل ہے۔ اس کے بعد تو اس افسانے کے بارے میں باقر صاحب کی رائے مزید خراب ہوگئی۔ باقر صاحب شہرت اور مقبولیت کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں۔ جو تخلیق جتنی مقبول ہوتی، باقر صاحب کی نظروں میں وہ اتنی ہی غیر معتبر قرار پاتی۔ سریندر پرکاش کا مشہور افسانہ 'بجوکا' شائع ہوا تو چاروں طرف اس کا چرچا ہونے لگا۔ ایک ریڈیو ٹاک میں باقر صاحب کو 'بجوکا' کا تجزیہ پیش کرنا تھا۔ باقر صاحب نے افسانے کے ایسے لتّے لیے کہ سریندر پرکاش عرصے تک خفا رہے۔

باقر صاحب کے مزاج کی خوبیاں اور خامیاں رفتہ رفتہ مجھ پر آشکار ہونے لگی تھیں۔ باقر صاحب نے احتشام صاحب کے انتقال پر ایک مضمون نما خاکہ لکھا۔ "ایک جواں برگد کی موت" مضمون بہت اچھا تھا۔ انھوں نے اس میں احتشام صاحب سے بمبئی میں اپنی ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ اس ملاقات میں کسی کتاب کے موضوع پر دونوں میں تکرار ہو جاتی ہے۔ بعد میں بیدی صاحب سچویشن کو سنبھال لیتے ہیں۔ احتشام صاحب کے چلے جانے کے بعد باقر صاحب نے بیدی صاحب سے پوچھا:

"آپ کی احتشام صاحب کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

بیدی صاحب نے کہا: "نہایت شستہ آدمی ہیں مگر عالم۔"

باقر صاحب بولے۔ "... سردار صاحب بھی ایسے ہی ہیں۔ اصل میں سب اپنی اپنی شیروانیوں میں بند ہیں۔"

بیدی صاحب نے جملہ کاٹتے ہوئے کہا: "اور میں اپنی داڑھی میں... اور میاں باقر تم کب تک ننگی دوپہر میں زندہ رہو گے؟"

بیدی صاحب کے آخری جملے کی بلاغت سے میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ "ننگی دوپہر" کے استعارے نے باقر صاحب کی شخصیت کے کئی گوشے روشن کر دیے۔ میں نے ان کی شخصیت کو مرکز میں رکھ کر ایک افسانہ لکھا "ننگی دوپہر کا سپاہی"۔ یہ افسانہ 'شب خون' میں چھپا تھا۔ یہ میرا پہلا تجریدی افسانہ تھا۔ اس میں ایک جگہ افسانے کا مرکزی کردار کہتا ہے۔ "ہاں میں نے علم کو شراب کی طرح پیا ہے اور کتابوں کو کاکروچ کی طرح چاٹا ہے۔" میں اس افسانے پر باقر صاحب کی رائے جاننا چاہتا تھا۔ اگرچہ میں جانتا تھا جو وہ کہیں گے جواب میں، تاہم میں نے ایک دن ڈرتے جھجکتے پوچھ ہی لیا:

"باقر صاحب! تازہ "شب خون" میں میرا افسانہ چھپا ہے...؟"

میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی انھوں نے کہا:

"ہاں پڑھا ہے۔ مجھے پسند نہیں آیا... مگر تم کتابوں کے اس قدر دشمن کیوں ہو؟"

میں ہنس دیا۔ مجھے اطمینان ہوگیا کہ افسانے کی ترسیل ہو چکی ہے۔

1977 میں میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ "ننگی دوپہر کا سپاہی" چھپ گیا۔ اگرچہ میں کتاب پر جلسہ کروانے کے حق میں نہیں تھا۔ مگر اظہار گروپ کے کنوینر محمود چھاپرا کے اصرار پر ہامی بھر دی۔ جلسہ محمود چھاپرا کے مکان پر ہوا۔

جلسے میں باقر مہدی، سریندر پرکاش، فضیل جعفری، عزیز قیسی کے علاوہ انور خاں حنیفا آتش، مشتاق مومن، جاوید ناصر وغیرہ بھی موجود تھے۔ جلسے کی صدارت کے لیے سریندر پرکاش کا نام تجویز ہوا۔ جلسے کی تفصیل تو اب یاد نہیں مگر باقر صاحب کی تقریر کی دو ایک باتیں یاد ہیں۔ تقریر کا آغاز ہی اس جملے سے ہوا۔

"سلام کو چاہیے کہ اس کتاب کو بھول جائے۔" پھر کئی افسانوں کا پوسٹ مارٹم کرتے رہے۔ آخر میں "انجام کار" کے تعلق سے اپنا موقف دوہرایا۔ "اس کہانی کا مرکزی کردار دارو کے اڈے پر سرینڈر ہو جاتا ہے جس سے افسانہ کمزور ہوگیا ہے۔"

سریندر پرکاش نے اپنی صدارتی تقریر میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا: "سلام کے افسانے کا ہیرو ایک عام آدمی ہے۔ وہ ہم اور آپ بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ کسی اسٹنٹ فلم کا ہیرو نہیں ہے کہ دارو کے اڈے پر جا کر سب کی ایسی تیسی کر دے۔ سلام کے افسانے کا انجام بالکل فطری ہے۔ مجھے افسانہ پسند ہے۔"

مجھے یاد ہے اس کے سال دو سال بعد ایک دن اچانک باقر صاحب ابراہیم نذیر کے ساتھ قصائی واڑا میرے گھر آئے۔ انہیں دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد جب ہم واپس ہونے لگے تو باہر گندگی کے ڈھیر پر بھاگتی کتروں اور بہتی نالیوں کو دیکھ کر باقر صاحب ناک پر رومال رکھتے ہوئے بولے۔

"دادا رے دادا... ترقی پسندوں کو سائبیریا بھیجنے کی بجائے یہاں بھیجنا چاہیے۔" ابراہیم نذیر نے برجستہ یاد دلایا "باقر صاحب! 'انجام کار' جیسا افسانہ یہاں رہ کر ہی لکھا جا سکتا تھا۔" باقر صاحب ایک لمبی 'ہوں' کے ساتھ خاموش ہو گئے تھے۔

1980 کے آس پاس مکتبہ جامعہ کے منیجر شاہد بھائی (شاہد علی خاں) جنرل منیجر بنا کر دلی بھیج دیے گئے۔ باقر صاحب اپنا مجگاؤں والا مکان فروخت کر کے کارٹر روڈ باندرہ میں منتقل ہو گئے۔ دھیرے دھیرے مکتبہ جامعہ کی سنیچری محفلوں کی رونق کم ہوتی گئی۔ باقر صاحب سے بھی اب ملاقاتیں کم کم ہونے لگیں۔ وہ اب مکتبہ جامعہ نہیں آتے تھے، ملنے والے خود ہی کبھی کبھی ان کے گھر باندرہ چلے جاتے تھے۔ ان کی صحت بھی اب ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ باقر صاحب کی ایک اور تقریر یاد آرہی ہے۔

1988 میں میرے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "معبر" شائع ہوا۔ انور خاں کے ساتھ دیگر احباب نے مل کر عبدالاحد ساز کے مکان پر ایک نشست کا انعقاد کیا۔ انور خاں نے پتا نہیں کس طرح باقر صاحب کو صدارت کے لیے راضی کر لیا۔ باقر صاحب کی رضا مندی پر مجھے خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی۔ لیکن جلسے میں ان کی صدارتی تقریر سننے کے بعد نہ خوشی باقی رہی نہ حیرت، بلکہ سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا۔ کیا تقریر ایسی بھی ہو سکتی ہے؟ جلسے کے آغاز میں ہی انھوں نے اعلان کر دیا کہ طبیعت کی ناسازی کے سبب وہ اپنی صدارتی تقریر پہلے ہی کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کتاب ہاتھ میں لے کر تقریر شروع کی۔ عجیب و غریب تقریر تھی۔ وہ کتاب کے اوراق الٹتے ہوئے ہر افسانے پر ایک آدھ فقرہ اچھال کر آگے بڑھ جاتے۔

"مدی... تمثیل ناکام ہے..."

"درمیانی صنف کے سورما... استعارہ بن نہیں پایا۔"

"دست بریدہ لوگ... کمزور ہے۔"

"کام دھیما... پچاس فیصدی اچھا ہے۔"

"معبر... چالیس فیصدی۔"

"نقشی... تیس فیصدی۔"

آخری ریمارک... "سلام بن رزاق کا یہ مجموعہ ان کے پہلے مجموعے سے زیادہ کمزور ہے۔

اچھا اب مجھے اجازت دیجیے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

اور اٹھ کر چلے گئے۔ بعد میں یوسف ناظم صاحب کی صدارت میں جلسہ جاری رہا۔

انور خاں، انور قمر، مشتاق مومن، آنند رام، عنایت اختر، سعید راہی اور اسلم خاں وغیرہ نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ باقر صاحب کی تقریر پر سامعین میں سے بعض نے اعتراضات کیے مگر باقر صاحب تقریر کر کے جا چکے تھے۔

مجھے ان کی تقریر پر کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ میرے افسانوں کے بارے میں وہ اس قسم کی رائے پہلے بھی دیتے رہے تھے۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد پھوٹ پڑنے والے فسادات اور پھر بمبئی بم دھماکوں کے دوران بمبئی میں عجیب نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ادبی محفلیں موقوف ہو چکی تھیں۔ احباب کا آپس میں ملنا ملانا بھی کم ہو گیا تھا۔ البتہ فون پر ایک دوسرے کی خیریت معلوم کر لیتے تھے۔ اس دوران میں نے فون پر دو ایک بار باقر صاحب اور قمری آپا کی خیریت دریافت کی تھی۔ بم دھماکے کو چار پانچ مہینے گزر چکے تھے۔ ممبئی کے حالات دھیرے دھیرے معمول پر آ رہے تھے۔ ایک دن اچانک باقر صاحب کا فون آیا۔ ان کا شعری انتخاب "سیاہ و سپید" چھپ گیا تھا۔ مجھے دینا چاہتے تھے۔ ویسے بھی ان سے ملے ہوئے کافی

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

اُردو دُنیا

مہاراشٹر میں بارہویں تک اردو میڈیم اسکول کھولنے کا فیصلہ

ممبئی (۸ نومبر)۔ مہاراشٹر الیکشن جیتنے کے بعد جھارکھنڈ اور کشمیر کے الیکشن جیتنے کے لیے پُرعزم بی جے پی اور اس کی نئی ریاستی حکومت اپنی مسلم مخالف شبیہ کو سدھارنے کی طرف متوجہ ہوتی نظر آرہی ہے۔ حکومت نے اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے تعلق سے کئی اہم فیصلے کیے ہیں۔ حکومت کے اقلیتی ترقیاتی محکمہ نے مہاراشٹر کے ہر ضلع میں اقلیتی طلبہ کے لیے پالی ٹیکنک کالج اور ہر تحصیل میں اردو میڈیم کے دسویں سے بارہویں تک اسکول کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اقلیتی محکمہ کے افسران کے ساتھ منعقدہ ایک میٹنگ میں اقلیتی امور اور اوقاف کے وزیر ایکناتھ کھڑسے نے یہ بھی ہدایت دی کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے جو بھی ضروری قدم اٹھائے جاسکتے ہیں انھیں پہلی فرصت میں اٹھایا جائے۔ انھوں نے افسران کو متنبہ کیا کہ اس میں تاخیر برداشت نہیں کی جائے گی۔ اقلیتی امور اور اوقاف کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد ایکناتھ کھڑسے نے پہلی مرتبہ اقلیتی ترقیاتی محکمے کا جائزہ لیا۔ انھوں نے بتایا کہ اسکولوں اور کالجوں میں اردو متبادل زبان کے طور پر تسلیم کی جائے گی اور اس کے لیے اقدام شروع کردیے گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ضلعی سطح کے کالجوں میں مسلم طلبہ اور طالبات کے لیے ہاسٹل بھی کھولے جائیں گے۔ اردو کو فروغ دینے کے لیے ہندی اور مراٹھی میں اردو ادب کا ترجمہ کروا کر ہر طبقے کے لیے دستیاب کرایا جائے گا۔ (انقلاب۔دہلی)

اردو ماہرین کے نہ ہونے سے حکومت پنجاب پریشان

بھٹنڈا، پنجاب (۱۰ نومبر)۔ پنجاب کے سرکاری دفاتر میں اردو زبان میں تحریر قدیم سرکاری ریکارڈ پڑھنے کے لیے ریاستی حکومت کو اردو جاننے والے ماہرین کی کمی پریشان کررہی ہے۔ ریاست میں پرانا سرکاری ریکارڈ اردو میں تحریر ہونے کی وجہ سے ریکارڈ تلاش کرنے اور اسے پڑھنے کے لیے اردو زبان کے ماہرین نہیں مل رہے ہیں جس کی وجہ سے سرکاری ملازموں اور عام لوگوں کو بھی کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

ریاست کے سرکاری دفاتر میں ۱۹۸۷ تک کا ریکارڈ موجود ہے لیکن اردو زبان میں تحریر اس ریکارڈ کو سمجھانے والے مل نہیں رہے ہیں۔ اردو زبان کا علم رکھنے والے زیادہ تر تحصیلدار اور نائب تحصیلدار اب تقریباً ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ زمینوں کی قیمت بڑھنے کے ساتھ لوگ ان کا پرانا ریکارڈ لینے کے لیے ریونیو ڈپارٹمنٹ تک پہنچ رہے ہیں لیکن محکمہ کے ملازمین انھیں ساتھ میں اردو پڑھنے والا بھی لانے کو کہتے ہیں۔ ریاست میں اب ایسے بہت کم لوگ ہیں جو اردو کا علم رکھتے ہیں اور نئی نسل بھی اب اسے سیکھنے میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتی۔

سرکاری دفاتر میں زیادہ تر پرانا ریکارڈ اردو میں تحریر ہونے کے سبب لوگوں کو اپنے بزرگوں کی پیدائش اور ڈیتھ سرٹیفکٹ نکلوانے میں دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ محکمہ صحت اور کارپوریشن کے دفاتر میں بھی اردو کا علم رکھنے والے ملازمین برائے نام ہی ہیں۔ تاہم محکمہ صحت نے اپنے ملازموں کو ہدایت دی ہے کہ اردو میں لکھے پیدائش سرٹیفکٹ کو پڑھنے کے لیے اردو ماہرین کا انتظام کرکے ہی انھیں تیار کیا جائے۔ دوسری طرف سرکاری ملازموں کا کہنا ہے کہ اب اردو ماہرین کو ڈھونڈنے میں کافی مشکل آرہی ہے۔ ذرائع کے مطابق پہلے ریاستی حکومت کی جانب سے پٹواری کی بھرتی کے لیے امیدواروں کے ساتھ اردو کی معلومات ہونے کی شرط رکھی جاتی تھی لیکن اب شاید یہ شرط ہٹالی گئی ہے اور اب پٹواری بھی اردو زبان سیکھنے کو ترجیح نہیں دے رہے ہیں۔ مسلم اکثریت والے علاقوں میں تو اردو پڑھنے والے مل جاتے ہیں لیکن دیگر علاقوں میں ان کی کمی ہے۔ حکام کے مطابق اس مسئلے کی وجہ سے اب پرانے ریکارڈ کو کمپیوٹرائزڈ کیا جارہا ہے۔ (راشٹریہ سہارا۔دہلی)

آندھرا پردیش میں 3 ہزار اساتذہ کے تقرر کی منظوری

حیدرآباد (۹ نومبر)۔ وزیر فینانس حکومت آندھرا پردیش مسٹر وائی رام کرشنوڈو نے آندھرا پردیش میں خالی تین ہزار اساتذہ کی اسامیوں پر تقرری کی منظوری دی ہے۔ مشرقی گوداوری ضلع میں میڈیا سے خطاب کرتے ہوئے مسٹر وائی رام کرشنوڈو نے بتایا کہ بہت جلد دس ہزار اساتذہ کی خالی اسامیوں پر تقرری کرلی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ حکومت کا یہ اقدام عوام سے ہر خاندان کے ایک فرد کو ملازمت کی فراہمی کی سمت پیش قدمی ہے۔ (رہنمائے دکن۔حیدرآباد)

اردو اسکولوں کی بقا اور تحفظ کو اساتذہ تحریک بنالیں

بنگلور (۱۵ اکتوبر)۔ اردو اسکولوں کو بچانے کے لیے اساتذہ اسے ایک تحریک بنالیں اور اردو سے محبت رکھنے والے تمام افراد بھی اس زبان کی ترقی و ترویج کے لیے جدوجہد کریں۔ ہمیں ایک دوسرے پر الزام عائد کرنے کی عادت ترک کرنی چاہیے۔ اب ہمیں یہ کہتے پھرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اردو کے ساتھ ناانصافی کس نے کی۔ کس نے اس کے ساتھ کھلواڑ کیا۔ بس اب یہ فکر کریں کہ ہم اس زبان کو بچانے کے لیے کیا کچھ کرسکتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ریاستی اردو کونسل کے چیئرمین جناب فیض اللہ بیگ جنیدی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم اساتذہ نے آج کچھ نہ کیا تو آنے والی نسل کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اس لیے آج یہ عہد کریں کہ ہم سب مل کر اس زبان کو زندہ رکھنے کے لیے ہرممکن قدم اٹھائیں گے۔ یہ اجلاس کونسل کے منشور شارع کے تحت ہوا۔ اس اجلاس میں بڑی تعداد میں اساتذہ کرام شریک ہوئے۔ (سالار۔بنگلور)

تلنگانہ میں اردو میڈیم اسکولوں کے مسائل کو حل کرنے کا عزم

ڈی ای او حیدرآباد سے نمائندگی

حیدرآباد (یکم نومبر)۔ ریاست تلنگانہ میں اردو زبان، اردو میڈیم مدارس اور اردو میڈیم اساتذہ کے مسائل کے حل کے لیے ریاست کی تمام اساتذہ تنظیموں سے وابستہ قائدین کے اشتراک سے تلنگانہ اسٹیٹ اردو ٹیچرس جوائنٹ ایکشن فورم کا قیام عمل میں آیا۔ محمد بشیر الدین کی قیادت میں اس فورم کا ایک وفد آج ڈی ای او حیدرآباد جناب ایم سومی ریڈی کے علاوہ پروجیکٹ آفیسر آر وی ایم ضلع حیدرآباد سے مل کر اردو میڈیم کی نئی درسی کتب کی موثر تدریس کے لیے دی جانے والی ٹریننگ پروگرام سے متعلق نمائندگی کی جس میں زور دیا گیا کہ یہ ٹریننگ صرف متعلقہ منڈلس ہی میں منعقد کی جائے۔ ایسے منڈلس جہاں اردو میڈیم مدارس کی کم تعداد ہے وہاں متصل منڈلس میں اس کا انعقاد عمل میں لایا جائے تاکہ لیڈی ٹیچرس کو سہولت ہو۔ فورم کے قائدین نے یہ بھی کہا ہے کہ ٹریننگ میں درکار مواد کو اردو میں مہیا کیا جائے۔ بہ صورت دیگر اس ٹریننگ کو بائیکاٹ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ضلع حیدرآباد کے تمام مدارس کے اوقات کار میں تبدیلی کے لیے ارباب مجاز سے نمائندگی جاری ہے۔ عنقریب اس مسئلے کا بھی حل نکل آئے گا۔ (سیاست۔حیدرآباد)

سردھنہ کے انگلش میڈیم اسکول میں اب اردو بھی پڑھائی جائے گی

سردھنہ (۱۸ اکتوبر)۔ اترپردیش میں اردو ثانوی زبان ہونے اور اس کو فروغ دینے کی غرض سے یہاں سردھنہ کے تحصیل روڈ پر واقع انگلش میڈیم اسکول میں اب اردو بھی پڑھائی جائے گی۔ گرین ویلی پبلک اسکول کی پرنسپل روبینہ انصاری نے یہ اطلاع دی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اب گرین ویلی پبلک اسکول میں دیگر مضامین کے ساتھ ساتھ اردو مضمون کی بھی تدریس ہوگی جس کے لیے دو اردو اساتذہ کی تقرری بھی کی گئی ہے۔ (راشٹریہ سہارا۔دہلی)

67 اُمیدواروں میں سے صرف 3 اردو اساتذہ کی ہی تقرری

نئی دہلی (۲۹ اکتوبر)۔ اردو ٹیچرز کی تقرری میں سب سے زیادہ مایوس کن رویہ شمال مشرقی دہلی کے ڈپٹی ڈائرکٹر کا رہا ہے، یہاں اساتذہ کی زبردست قلت کے باوجود محکمہ جان بوجھ کر چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر امیدواروں کے نام خارج کررہا ہے۔ یہاں ڈپٹی ڈائرکٹر کے ریٹائرمنٹ کے بعد سارا کام ایجوکیشن آفیسر دیکھ رہے ہیں جن کے بارے میں بتایا جارہا ہے کہ ان کا رویہ ٹھیک نہیں ہے۔ ٹی جی ٹی اردو گیسٹ ٹیچر کے تقرر کے لیے شمال مشرقی ضلع میں پہلی لسٹ ۲۳ اکتوبر ۲۰۱۴ کو آئی جس میں کل ملاکر 24 امیدواروں کے نام تھے جن میں 17 خواتین اور 7 مرد شامل تھے۔ اس لسٹ میں تصدیق کے بعد صرف ۴ ناموں شہباز عالم، چمن سنگھ، بانکے لال اور عرشی کا انتخاب کیا گیا جنھیں چار اسکول الاٹ کیے گئے۔

اہم بات یہ ہے کہ بانکے لال کو جی جی ایس ایس اسکول، سونیا وہار الاٹ کیا گیا جہاں اردو کی کوئی پوسٹ نہیں تھی اور نہ ہی کوئی اردو پڑھنے والا بچہ تھا۔ اس سلسلے میں قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کے کوآرڈینیٹر مظفر علی خاں نے ضلع کے ایجوکیشن آفیسر سے ملاقات کرکے بتایا کہ صرف یمنا وہار میں 5 اسکول ایسے ہیں جہاں کافی بچوں کی تعداد ہے اور پوسٹ بھی سینکشن ہے، کل ملاکر 10 ٹیچرز کی ضرورت ہے جب کہ سونیا وہار میں کسی اردو ٹیچر کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر آفیسر نے جواب دیا کہ ہمیں سب پتا ہے۔ اگر وہاں ضرورت نہیں ہوگی تو واپس بھیج دیا جائے گا۔ جن 4 لوگوں کا انتخاب ہوا ان میں سے دو لوگ اسکولوں میں جوائننگ کے لیے گئے تو ان میں شہباز عالم کو معمولی چوک کی وجہ سے جوائننگ نہیں دی گئی اس طرح صرف عرشی کی ہی تقرری ہو پائی، یعنی 24 میں سے صرف ایک اردو ٹیچر ہی اہل قرار دیا گیا باقی سب کو نااہل قرار دیا گیا ہے۔

دوسری لسٹ ۲۲ اکتوبر ۲۰۱۴ء کو آئی جس کی تصدیق ۲۸ اکتوبر کو ہونی تھی۔ اس لسٹ میں کل 43 امیدواروں کا نام آیا۔ گزشتہ روز 15 امیدواروں کا انتخاب ہوا جس میں صرف جمیلا بیگم کی تقرری ہو پائی اور آج 12 امیدواروں کا انتخاب ہوا جس میں صرف تبسم جہاں کا ہی نام

(بقیہ صفحہ ۵ پر)

ملک بھر میں اردو اخبارات وجرائد کا سرکولیشن 3.45 کروڑ سے متجاوز

ہندی اخبارات وجرائد 22 کروڑ سے بھی زائد سرکولیشن کے ساتھ سرفہرست

انگریزی کو دوسرا مقام اور اردو کو تیسرا مقام - آر این آئی کی رپورٹ

نئی دہلی (۵ نومبر)۔ الیکٹرانک میڈیا کی بڑھتی مقبولیت کے باوجود ملک میں اخبارات و رسائل کا سرکولیشن مسلسل بڑھ رہا ہے اور گزشتہ سال کے دوران یہ 45 کروڑ کے پار پہنچ گیا۔ ہندوستانی اخبارات کی رجسٹرار آر این آئی کی مرتب کردہ پرنٹ میڈیا کی 58 ویں سالانہ رپورٹ 'پریس ان انڈیا 2013-14' کے مطابق گزشتہ سال کے دوران ملک میں ہندی اخبارات اور میگزین کے سرکولیشن کی تعداد 22 کروڑ 64 لاکھ 75 ہزار 517 تک پہنچ گئی ہے۔ یہ اعداد وشمار اخبارات و رسائل کے ذریعے آر این آئی کو مہیا کرائے گئے اعداد وشمار پر مبنی ہیں۔

رپورٹ کے مطابق گزشتہ سال ملک میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی تعداد میں 5.95 فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ مارچ ۲۰۱۴ء تک ملک میں رجسٹرڈ مطبوعات کی تعداد 99660 تک پہنچ گئی۔ ان میں اخبارات کی تعداد 13761 اور دیگر رسائل کی تعداد 85890 ہے۔ سال 2013-14 کے دوران کل 5642 اخبارات و جریدوں کا رجسٹریشن ہوا جب کہ اس دوران کل 49 اشاعتیں بند ہوئیں۔ ملک کے زیادہ تر حصے میں بولی جانے والی ہندی کے رجسٹرڈ مطبوعات کی تعداد سب سے زیادہ 40149 ہیں۔ ان میں 5870 اخبار اور 34289 دیگر جریدے ہیں۔ دوسرے مقام پر انگریزی ہے جس کے اخبارات وجریدوں کی تعداد 13138 ہے۔ اس ترتیب میں مراٹھی تیسرے نمبر پر ہے جس کے اخبارات و رسائل کی کل تعداد 5.755 ہے۔

ملک بھر میں اخبارات و رسائل کا کل سرکولیشن 45 کروڑ 5 لاکھ 86 ہزار 213 ہے جن میں ہندی سب سے آگے ہے۔ اس کی کل اشاعت 22,64,75,517 ہے۔ دوسرے نمبر پر انگریزی ہے جس کے اخبارات اور جریدوں کا سرکولیشن 6,44,05,643 ہے۔ اردو کا تیسرا مقام ہے جس کے اخبارات اور جریدوں کا سرکولیشن 3,45,85,404 ہے۔ ملک میں سب سے زیادہ سرکولیشن والا روزنامہ 'آنند بازار پتریکا' ہے جو بنگلہ زبان میں شائع ہوتا ہے۔ اس کی کل اشاعت 11,81,112 ہے۔ ہندی زبان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا اخبار پنجاب کیسری ہے جس نے کل سرکولیشن 7,23,803 بتایا ہے۔ سب سے بڑا انگریزی روزنامہ 'ٹائمس آف انڈیا' (ممبئی) ہے جس کا کل سرکولیشن 10,26,153 ہے۔ آر این آئی کے مطابق مختلف اڈیشن کے ساتھ سب سے زیادہ سرکولیشن والا روزنامہ 'ٹائمس آف انڈیا' ہے جس کے کل 29 اڈیشن ہیں جب کہ اس کا کل سرکولیشن 47,42,671 ہے۔ اس لحاظ سے 'دینک بھاسکر' دوسری پوزیشن پر ہے جو کل 95 اڈیشن کے ساتھ 35,49,706 سرکولیشن رکھتا ہے۔

ریاستوں میں اترپردیش سب سے زیادہ 15,209 اخبارات و رسائل کے ساتھ سب سے آگے ہے جب کہ مہاراشٹر 13,375 اخبارات وجرائد کے ساتھ اس کے پیچھے ہے۔ ملک بھر میں کل 99,660 رجسٹرڈ اخبارات وجریدے ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

تلنگانہ اسمبلی میں ضروری کاغذات کے اردو میں ترجمے کا کوئی نظم نہیں - اسپیکر سے نمائندگی

حیدرآباد (۱۸ نومبر)۔ تلنگانہ حکومت نے اردو زبان کو مناسب مقام دینے کا اعلان تو کیا ہے لیکن قانون ساز اسمبلی میں اردو کی حالت دگرگوں ہے۔ اسمبلی ایجنڈہ اور اس سے متعلق دیگر ضروری کاغذات کا اردو میں ترجمے کا کوئی نظم نہیں ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اردو مترجمین کا آندھرا پردیش اسمبلی کے لیے الاٹمنٹ کردیا گیا اور تلنگانہ اسمبلی میں کوئی اردو داں نہیں ہے جب کہ ضرورت تلنگانہ میں بھی ہے۔ اسمبلی میں آج ارکان نے اسپیکر سے اس سلسلے میں شکایت کی۔ شہر کے ایک رکن اسمبلی نے اسپیکر مدھوسودن چاری کی توجہ اس بابت مبذول کرائی کہ برقی اور دیگر شعبوں میں تلنگانہ سے ناانصافی کے خلاف کل اسمبلی میں منظور کی گئی قرارداد کا اردو اور انگریزی میں ترجمہ آج تک پیش نہیں کیا گیا۔ یہ قرارداد صرف تلگو میں ارکان کو فراہم کی گئی۔ رکن اسمبلی نے شکایت کی کہ متعلقہ حکام کی توجہ دہانی کے باوجود انگریزی میں بھی قرارداد نہیں دی گئی جس کے سبب وہ قرارداد کے متن سے لاعلم ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تلنگانہ اسمبلی میں اردو اسٹاف نہیں اور نہ ہی اردو ٹرانسلیٹر ہے جو غیر تلگو داں ارکان کو مائکروفون میں تلگو کا اردو میں ترجمہ پیش کرتا ہے۔ ارکان نے شکایت کی کہ تلنگانہ اسمبلی میں موجود اردو اسٹاف کو آندھرا پردیش کے لیے الاٹ کردیا گیا جب کہ ضرورت تلنگانہ میں بھی ہے۔ ارکان نے اسپیکر سے اپیل کی کہ وہ اردو اسٹاف کے تقرر پر توجہ دیں۔ وزیر فینانس اور اسپیکر نے ارکان کو یقین دلایا کہ بہت جلد اردو میں ترجمے کا اہتمام کیا جائے گا اور تمام ضروری کاغذات اردو میں فراہم کیے جائیں گے۔

(سیاست، حیدرآباد)

محبوب نگر میں اردو اساتذہ کے تقرر کا مطالبہ

محبوب نگر، تلنگانہ (۲۸ اکتوبر)۔ مسلم حقوق پراجا سمیتی محبوب نگر کے ایک وفد نے ضلع کلکٹر محبوب نگر پریہ درشنی سے ملاقات کی اور انھیں ایک یادداشت پیش کی جس میں بتایا گیا کہ ضلع میں اردو میڈیم مدارس میں ایس جی ٹی اور اسکول اسسٹنٹس کی جملہ 105 اسامیاں خالی ہیں تاہم عہدیداروں کی جانب سے صرف 85 اسامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ وفد نے بتایا کہ نصف تعلیمی سال گزر چکا ہے تاہم 85 اسامیاں منظور کی گئی ہیں، مزید 80 اسامیاں خالی ہیں۔ وفد نے مسدوس نگر گورنمنٹ پرائمری اسکول کا حوالہ دیا اور بتایا کہ اس اسکول میں تقریباً 100 طلبہ زیر تعلیم ہیں تاہم یہاں ایک بھی ٹیچر نہیں ہے۔ وفد نے بتایا کہ ضلع کے بیشتر سرکاری مدارس کا یہی حال ہے۔ وفد نے کلکٹر سے مطالبہ کیا کہ اکیڈمک انسٹرکٹرس کی اسامیوں پر تقرر کے دوران کوالیفائیڈ امیدواروں کی عدم موجودگی میں مقامی نان کوالیفائیڈ امیدواروں کو منتخب کیا جائے۔ کلکٹر نے وفد کی تمام باتوں کو سماعت کی اور اس سلسلے میں پروجیکٹ آفیسر راجیو ودیا مشن کو رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت دی۔ وفد میں محمد تقی حسین تقی، محمد سمیع الدین، محمد اظہر علی، محمد ذوالفقار علی اور محمد دستگیر شامل تھے۔

(اعتماد، حیدرآباد)

سرکاری اردو میڈیم مدارس میں اکیڈمک انسٹرکٹرس کے تقرر کا مطالبہ

حیدرآباد (۱۳ نومبر)۔ اسٹیٹ اردو ٹیچرس اسوسی ایشن آندھرا پردیش (سوٹا) کے قائدین نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ راجیو ودیا مشن کے تحت سرکاری مدارس میں اکیڈمک انسٹرکٹرس کی منظوری کا عمل جاری ہے اور سرکاری اردو میڈیم مدارس میں طلبہ کی تعداد کے لحاظ سے اساتذہ کی اسامیاں منظور نہیں ہیں جس کی وجہ سے انگلش طلبہ و طالبات کو درس و تدریس میں کافی مشکلات کا سامنا ہے۔ سرکاری اردو مدارس میں طلبہ وطالبات کی تعداد کی بنیاد پر اکیڈمک انسٹرکٹرس کی اسامیوں کی منظوری اور تقرری کی ضرورت ہے، لہٰذا ارباب مجاز خاص کر وزیر تعلیم، وزیر اقلیتی بہبود اور ڈائرکٹر راجیو ودیا مشن (R.V.M) سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ سرکاری اردو مدارس میں طلبہ کی تعداد کے لحاظ سے اکیڈمک انسٹرکٹرس کی منظوری اور تقرر کو روبہ عمل لایا جائے۔

(سیاست، حیدرآباد)

اردو کو اُس کا جائز حق اور مقام دیا جائے

اورنگ آباد، بہار (۱۸ اکتوبر)۔ اردو زبان اپنے ہی ملک میں اجنبی ہوکر رہ گئی ہے۔ وزیر اعلا جیتن رام مانجھی اور سابق وزیر اعلا نتیش کمار نے بھی اپنے دور حکومت میں اس کو جائز مقام دلانے کی کوششیں کیں جو سوئے اتفاق ابھی تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکیں۔ اسی طرح اردو زبان اور ادب کی ترویج و اشاعت میں مصروف ریاست کے کئی اہم ادیب و شاعر اور اردو کتابوں کے مصنفین ہیں جن کی ادبی خدمات کا اعتراف نہیں کیا جاسکا ہے۔ افسوس کہ ادبی تخلیق کاروں کے حوصلے اکثر تعصب اور حکومت کی بے توجہی کی نذر ہوجاتی ہیں۔ یہ باتیں تنظیم فلاح ملت کے مولانا کبیر الدین فاران نے کہی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو میڈیم جونیر کالج کے لیے اساتذہ کے تقرر کا مطالبہ

منتھنی، تلنگانہ۔ منتھنی میں واقع اردو میڈیم جونیر کالج کے لیے لکچررس کی اسامیوں کی فی الفور منظوری کے لیے اردو ترقیاتی کمیٹی کے عہدیداروں نے ایک تفصیلی یادداشت رکن اسمبلی منتھنی مسٹر سی رام موہن ریڈی کے حوالے کی۔ یادداشت میں مطالبہ کیا گیا کہ منتھنی میں بارہ سال سے قائم اردو میڈیم جونیر کالج کے لیے لکچررس کی اسامیوں کی منظوری کے علاوہ کالج میں جاری سیکشن کا بھی اضافہ کیا جائے۔ واضح رہے کہ منتھنی میں اردو میڈیم کالج کے قیام اور منظوری کے بعد سے مسلسل پچھلے بارہ سال سے لکچررس کی تنخواہوں کا نظم مسلمانان منتھنی اپنے تعاون سے کررہے ہیں اور اس سلسلے میں اب تک کئی مرتبہ نمائندگیاں کی گئیں مگر نتیجہ لاحاصل رہا۔ کالج ترقیاتی کمیٹی اور اردو ترقیاتی کمیٹی کے ذمہ داروں کے علاوہ مسلمانان منتھنی نے تلنگانہ حکومت بالخصوص نائب وزیر اعلا جناب محمود علی سے مطالبہ کیا کہ وہ لکچررس کی اسامیوں کی منظوری کو یقینی بناتے ہوئے ان کا تقرر عمل میں لائیں اور ساتھ ہی ایم ایل اے منتھنی مسٹر رام موہن ریڈی سے بھی بھرپور دلچسپی کے اظہار کی خواہش کی۔

(سیاست، حیدرآباد)

رشید وے نے از دل ما

نئی دہلی۔ اردو کے معروف شاعر جناب حاصل سنبھلی کا ۸ نومبر ۲۰۱۴ء کو دیگر واقع ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ وہ 82 برس کے تھے اور کافی عرصے سے علیل تھے۔ بعد نماز عشاء انھیں دیگر قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ چار بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ حاصل سنبھلی کا شمار دہلی اور خصوصاً مشرقی دہلی میں ادب کے معماروں میں کیا جاتا تھا۔ وہ ۱۹۳۲ء میں ضلع سنبھل کے محلہ کوٹ عربی میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں مولانا منظور سنبھلی اور بعد میں کلیم شاہ آبادی کی شاگردی اختیار کی اور خود کو ایک مستند معتبر شاعر تسلیم کرالیا۔ وہ غزل کے ساتھ نعت پاک ضرور کہتے تھے۔ ان کے کئی مجموعۂ کلام منظر عام پر آچکے ہیں جس میں انکار رحمت، بہار رحمت اور منزل بہ منزل خاصے مقبول ہوئے ہیں۔ اُن کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں اردو اکادمی اور دیگر ادبی انجمنوں نے اپنے ایوارڈز سے سرفراز کیا تھا۔ ان کی تدفین میں ادبا و شاعر کے علاوہ کثیر تعداد میں عام لوگوں نے شرکت کی۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے
دو کتابوں کا
آنا ضروری ہے

نام کتاب : لفظوں کی مسیحائی
شاعر مصور : ڈاکٹر اعظم
ضخامت : ۱۷۰ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ملنے کا پتا : عرشیہ پبلی کیشنز، A-170،
گراونڈ فلور، سوریہ اپارٹمنٹ
دلشاد کالونی دہلی-95
تبصرہ نگار : سعید اختر اعظمی
akhtar0075@gmail.com

رومان اور حالات حاضرہ دو مختلف پہلو ہیں۔ اول میں ہجر و وصال کی کشاکش ہے تو دوم میں مسائل حیات اور سماجی تناظر۔ ایک ارض دل سے پھوٹتا اور جذبہ و احساس کے توسط سے آبیاری لاتا ہے تو دوسرا درد کی صلیب عطا کرتا ہے۔ ڈاکٹر اعظم کے یہاں یہ دونوں روپ اپنی تمام تر توانائی کے ساتھ موجود ہیں۔ وہ گل رخوں کی بے رخی کا ذکر جنون شوق کے عالم میں کرتے ہیں تو دیوار و در اور چھت کے تذکرے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ بسا اوقات وہ انھیں ایک پلیٹ فارم پہ لاکھڑا کر دیتے ہیں جب حُسن بے پیا دل کو اردو جریدے سے تعبیر دیتے ہوئے خریداروں کے فقدان پہ ماتم کناں ہوتے ہیں۔

'لفظوں کی مسیحائی' ڈاکٹر اعظم کے خامے کی لکیروں اور جذبوں کی آویزش کو خوب صورت ارتباط ہے۔ روایات سخن کو برتتے ہوئے انھوں نے سلاست فکر کو جابجا نمایاں کیا ہے۔ محبت کی عنایت اور بے توجہی کے یہ رنگ دیکھیے:

تھی میں ہی کچھ کشش تھی کہ اپنا تھا جذب شوق
تیرے سوا کسی کے بھی قائل نہیں ہوئے

جب کسی شام کوئی یاد پرانی آئی
زخم دل کھل اٹھے ہاتھوں میں روانی آئی

ہجر کے غم سے نہ سوئے رات بھر اچھا ہوا
بچ گئے ہم یوں تقاضے سجدۂ اشراق سے

میں رسما مسکراتا ہوں جدا ہوتا ہوں جب اس سے
مگر آنکھوں میں اپنی کچھ نمی محسوس کرتا ہوں

یہ آہنگ قرب و جوار اور اپنے وجود کے قریب کے مشاہدے کا ہے:

شہر کی رنگینیاں اپنی جگہ اعظم، مگر
ہم کو اپنے گاؤں کی آب و ہوا اچھی لگی

خلوص دل سے یہاں ایک بھی بشر نہ ملا
فقط ملاں سے کالونیوں میں گھر نہ ملا

کسی کی بچی کا اعظم دوال کا منظر
خوشی بھی دیتا ہے سب کو رلا بھی دیتا ہے

بچوں کی خواہشات کی تکمیل کے لیے
اپنی ضرورتوں کو گھٹانا پڑا مجھے

ہمارے گھر میں ابھی تک ہے ایک دسترخوان
بکھرتے دور میں اب یہ نہیں کرامت کیا

بتا مجھے نمازیں پڑھ رہا ہوں
عبادت کیا ہے، ورزش ہو رہی ہے

غزلوں کے ساتھ ہزلیں، حمد و نعت، مناجات و دعا اور نظمیں بھی اس مجموعے کی زینت ہیں جن میں فریاد، بہار، آہنگ، جام جہاں، پہلے نہ تھا آج کا بھارت، کچھ قوم مسلماں سے، عید پر، بھلا بیٹھے، شہر بھوپال، ایک واقعہ اور تینوں سے برسات کی شمولیت ہے۔ افتخار امام صدیقی، شفیقہ فرحت، کوثر صدیقی، دوبے بہادر سنگھ اور انوار الاسلام کی آرا سے معمور یہ مجموعہ ڈاکٹر اعظم کی فکری انفرادیت کا اعلامیہ بھی ہے:

اپنی ہی روشنی میں چمکنا قبول ہے
ہرگز نہیں فلک کے مہ و کہکشاں سے ہم

میرا مقابلہ نہیں غالب سے، میر سے
اعظم جو میرا طرز سخن ہے مرا تو ہے

OOO

نام کتاب : آناپ شناپ
مصنف : ڈاکٹر محبوب راہی
ضخامت : ۱۷۶ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ملنے کا پتا : ڈاکٹر محبوب راہی، بارسی ٹاکلی
ضلع آکولہ، مہاراشٹر
تبصرہ نگار : مفتی حبیب الرحمن ندوی
multihabib0786@gmail.com

شعر و ادب کی مختلف اصناف پر چالیس سے زائد تصانیف کے خالق ڈاکٹر محبوب راہی نے عصری شعر و ادب کے تقریباً ہر میدان میں اپنی تخلیق کے وسیلے سے اپنے نقوش پائدار ثبت کیے ہیں۔ سنجیدہ ادب تو درکنار راہی صاحب نے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں بھی اپنے کمالات کا خوب خوب مظاہرہ کیا ہے۔ موصوف کی مختلف موضوعات پر مبنی طنزیہ و مزاحیہ منظومات ملک کے کم و بیش تمام رسائل و جرائد میں بالخصوص طنز و مزاح کے واحد ترجمان ماہنامہ 'شگوفہ' حیدرآباد میں مسلسل بہ کثرت اور نمایاں طور پر اشاعت پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ ان تمام منظومات کو یکجا کر کے ۲۰۰۵ء میں اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونہ کے صدر جناب منور پیر بھائی نے 'آناپ شناپ' کے عنوان سے شائع فرمایا تھا، یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ شائقین شعر و ادب کے مسلسل تقاضوں کی پیش نظر حال ہی میں 'رحمانی پبلی کیشنز' مالیگاؤں نے کئی تازہ نظموں کے اضافے کے ساتھ اس کتاب کا دوسرا اڈیشن شائع کیا ہے، جس میں شاعر کی اور 'آناپ شناپ' کی وجہ تسمیہ اور معروف طنز و مزاح نگار مرحوم رضا نقوی واہی کے پیش لفظ بہ عنوان 'آناپ شناپ کا ٹریلر' کے علاوہ مختلف اور دل چسپ عنوانات کے تحت ایک سو چار (104) طنزیہ و مزاحیہ نظمیں اس مجموعے میں شامل ہیں، جن میں چند عنوانات اس طرح ہیں 'شعر سنانے پہ تلا ہے'، 'کنوارے کی دعا'، 'بچ بولتا باپ ہے'، 'ایکٹر سے منسٹر تک'، 'ہائے الیکشن'، 'رشوت کی کرشمہ سازیاں'، 'اچھے حربے' میں ہیں وغیرہ۔

لگے ہاتھوں چند اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں تاکہ راہی صاحب کی طنزیہ و مزاحیہ رنگارنگی کا اندازہ ہو سکے:

تک بند شاعروں کے اشعار بک رہے ہیں
گاتے ہیں بھیرویں اور ملہار بک رہے ہیں

افسر کی ڈانٹ سن کر بیوی کی مار کھا کر
بچوں کو مارنے کی عادت سی پڑ گئی ہے

نوٹ، سوالی، چور، اُچکے حربے میں ہیں
پولیس کی دھیترچھاپہ میں سارے حربے میں ہیں

بدل کے بھیس پھر آتے ہو پانچ سال کے بعد
پھر اور سانگ رچاتے ہو پانچ سال کے بعد

بتاؤ جاکے ترے کہاں تم اتنے دن
لب اپنی شکل دکھاتے ہو پانچ سال کے بعد

راہی صاحب کی زود گوئی اور کثیر الکلامی کا ملک کے اردو کے بیشتر نامور ارباب قلم نے اعتراف کیا ہے، یہاں چند مختصر رائیں پیش کرنا مناسب ہوگا:

- محبوب راہی بے ساختہ صنائع بدائع کے شاعر ہیں اور محاسن و معائب شاعری کا درک رکھتے ہیں، ان خوبیوں کو مزاح گوئی میں نباہنا مشکل ہے لیکن موصوف یہ بھی کر گزرے۔
(یوسف ناظم)

- محبوب راہی کی خوبیوں میں جو سب سے بڑی خوبی مجھے اُن کا گرویدہ بناتی ہے وہ ہے ان کا زورِ بیان، میرا دل چاہتا ہے شور زور بیان کہوں، معلوم نہیں کس مستجاب الدعوات بزرگ نے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ کی دعا دی تھی، چناں چہ شاعری میں ان کی قوت تخلیق کا جواب نہیں۔
(ناوک حمزہ پوری)

- آپ نے 'دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے' پر عمل کرتے ہوئے اپنے اشہب قلم کو شعر و ادب کے بحر و بر میں اس طرح دوڑایا ہے کہ کوئی گوشہ نہ چھوڑا! رسا ہمدانی، حرمت الاسلام اور کرشن موہن کے دار فانی سے عالم بالا میں پہنچ جانے پر اب میں دیکھ رہا ہوں کہ اس ہمہ ظلمات میں آپ تن تنہا گھوڑے دوڑاتے ہوئے یہ نعرہ بھی لگاتے جا رہے ہیں کہ

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

مگر کم از کم میری نظروں میں تو اس وقت دور دور تک آپ کا کوئی حریف نظر نہیں آ رہا ہے۔ (رضا نقوی واہی)

اپنے دور کے اس بے مثال زود گو اور کثیر الکلام شاعر کے طنزیہ و مزاحیہ شگوفوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے 'آناپ شناپ' کا مطالعہ ناگزیر ٹھہرتا ہے!

OOO

گفتگو اُن کی

اطہر فاروقی

- اپنی نوعیت کی یہ ایک اہم کتاب ہے جس میں اہم علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی شخصیتوں کے انٹرویوز شامل ہیں۔ ان شخصیتوں میں اردو زبان و ادب کے کئی ممتاز تخلیق کار، محقق اور نقاد شامل ہیں تو کئی اہم سیاست داں اور کچھ دیگر شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والی ہستیاں۔ کچھ شخصیتوں کے نام ہیں: مرارجی ڈیسائی، وی. پی. سنگھ، محمد خاں جونیجو، دلائی لاما، دلیپ کمار، میر خلیل الرحمٰن، جسٹس جاوید اقبال، امتیاز احمد، اختر الایمان، مجروح سلطانپوری، احمد فراز، رشید حسن خاں، شمس الرحمٰن فاروقی، خلیق انجم، رالف رسل، محمد حسن، قمر رئیس اور نامور سنگھ وغیرہ۔
- اطہر فاروقی صاحب نے کوشش کی ہے کہ انٹرویو کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہو تاکہ عام اردو قارئین کی بھی دل چسپی قائم رہے۔

ضخامت: ۳۰۰ صفحات ——— قیمت: ۱۵۰ روپے

بقیہ: باقر مہدی سے... ملاقاتیں

صفحہ ۳ سے آگے

عرصہ ہو گیا تھا۔ میں شام کو گھر پہنچ گیا۔ انتظار ہی کر رہے تھے۔ بہت اچھے موڈ میں تھے۔ بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پرانی باتیں یاد کر کے قہقہے لگا رہے تھے۔ بابری مسجد کے انہدام، فسادات اور اس کے بعد بم دھماکے کو لے کر بہت ڈسٹرب تھے۔ 'سیاہ و سپید' کا ایک نسخہ دستخط کر کے دیا۔

میں نے کہا... "میں اس پر تبصرہ کروں گا۔"

بولے... "بالکل نہیں..."

میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا: "اگر آپ منع کرتے ہیں تو نہیں کروں گا۔"

شام ہونے لگی تھی۔ میں نے اجازت چاہی۔ کہنے لگے۔ "مجھے ڈاکٹر نے منع کیا ہے مگر تم دو ایک پیگ لے سکتے ہو۔" میں نے منع کرنا چاہا۔ مگر وہ نہیں مانے۔ بلکہ خیری آپا سے کہا: "خیری! اسلام کھانا کھا کر جائیں گے۔"

میں نے ان کے ساتھ بیسیوں بار شراب پی ہے اور کھانا کھایا ہے۔ مگر اس روز ان کے اس شفقت آمیز رویے نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔

اگرچہ یہ سچ ہے کہ وہ ایک ناہموار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ کب کس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے، کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ بہت معمولی سی بات سے خوش ہو جاتے تھے اور اس سے بھی زیادہ معمولی بات پر خفا ہوتے تھے۔ ان کی شخصیت اجتماع ضدین کا نادر نمونہ تھی۔ ایمرجنسی کے زمانے میں اپنے دیرینہ دوست قاضی سلیم کو اس لیے گھر سے نکال دیا تھا کہ وہ کانگریس

کے حامی تھے۔ قاضی سلیم ان دنوں مہاراشٹر اسمبلی میں ایم ایل سی تھے۔ سٹی میں جن تین چار لوگوں سے ان کے مراسم ٹھیک ٹھاک تھے، ان میں الیاس شوقی کا نام بھی شامل ہے۔ الیاس شوقی نے ان کی دو تین کتابیں بھی چھاپی ہیں۔ ایک دن باقر صاحب کو پتا چلا کہ الیاس شوقی کے آٹھ بچے ہیں تو بہت خفا ہوئے۔ "وادا رے وادا!! اتنے بچے۔" اور انھیں اپنے گھر آنے سے منع کر دیا۔ (باقر صاحب لاولد تھے ایک غیر معتبر خبر یہ بھی تھی کہ باقر صاحب اور خیری آپا میں شروع ہی سے اولاد پیدا نہ کرنے کا خاموش معاہدہ ہو گیا تھا۔ واللہ اعلم...)

انور خاں ایک عرصے تک ان سے بے حد قریب رہے ہیں مگر ایک دن ان پر اس لیے خفا ہو گئے کہ انھوں نے ایران میں قائم ہونے والی اسلامی طرز حکومت کی تعریف کردی تھی۔ بولے "تم ایک بنیاد پرست حکومت کی تعریف کرتے ہو۔ تم میں اور تمہاری بہن میں بس یہی فرق ہے کہ وہ برقعہ پہنتی ہے اور تم برقعہ نہیں پہنتے۔"

انور خاں کو باقر صاحب سے ایسے سخت ریمارک کی توقع نہیں تھی۔ وہ ایک عرصے تک ان سے ملنے نہیں گئے۔

یعقوب راہی ان کے قریب ترین لوگوں میں سے ہیں۔ ایک مدت سے باقر صاحب نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا مگر یعقوب راہی ان سے برابر ملتے رہتے تھے۔ ایک بار کسی بات پر بحث کے دوران ان سے کہہ دیا: "تم ہر ہفتہ مجھ سے ملتے ہو، مگر تم مطالعہ نہیں کرتے۔ آئندہ کوئی نئی کتاب پڑھنے کے بعد ہی مجھ سے ملنا۔"

بادی النظر میں ان سارے واقعات سے بدسلوکی بلکہ سفا کی جھلکتی نظر آتی ہے۔ مگر شاید پس پردہ فیصد 'اصلاح' کی بھی ہو سکتی ہے۔ چوں کہ دونوں کی گفتگو ان کے مزاج کا خاصہ تھا جتنا وہ چھوڑتے۔ پر مراسم رکھنے کی بجائے سیدھے نشتر لگاتے تھے۔

مرحوم ظ انصاری نے ان کے بارے میں کیسی پتے کی بات کہی ہے: "جب بھی... قلم سے کوئی اچھی اور اور جنجل بات نکلتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ باقر کو دکھاؤں۔ کیوں کہ وہ سان ہیں جس پر چڑھ جائے بغیر چاقو کی دھار چل جاتی ہے۔"

آج میں بھی اپنے افسانوں کے تعلق سے ان کی انتہا پسندی پر غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ میرے افسانوں میں اگر خوبی کی کوئی بات پیدا ہو گئی ہے تو ممکن ہے اس کی وجہ یہی ہو کہ میرے افسانے ہمیشہ ان کی سان پر چڑھے رہتے تھے۔

اگرچہ میں نے ان سے کبھی اصلاح نہیں لی مگر ان کی تنقید کا تازیانہ کھا کر میرا اشہب قلم شاید زیادہ چوکس ہو جاتا تھا اور لاشعوری طور پر میں خود احتسابی کے عمل سے دوچار ہوتا تھا۔

ایک عرصے سے ان کی صحت خراب چل رہی تھی۔ کئی بیماریوں نے گھیر رکھا تھا۔ موت سے تین سال پہلے ان کی قوت گویائی چلی گئی۔ یہ بہت بڑا سانحہ تھا۔ سال بھر پہلے میں یعقوب راہی کے ساتھ ملنے گیا، تاکہ سے ملے۔ مگر دیکھ کر دل پر چوٹ لگی۔ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ بال اڑ چکے تھے۔ دانت ٹوٹ گئے تھے۔ گالوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ گردن کی نسیں تک دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک گندے ٹی شرٹ اور میلی تہہ میں سکڑ سمٹ کر مٹھی بھر رہ گئے تھے۔ بیماری نے انھیں دیمک کی طرح چاٹ لیا تھا۔ مگر سب سے زیادہ تکلیف دہ صورت حال یہ تھی کہ بات نہیں کر سکتے تھے۔ صرف اشاروں میں بچوں کی طرح غوں غاں کی آواز نکال کر مافی الضمیر سمجھانے کی کوشش کرتے، نہیں سمجھا پاتے تو غوں غاں کی آواز نکال کر مافی الضمیر سمجھانے کی کوشش

کرتے۔ نہیں سمجھا پاتے تو ٹوٹی پھوٹی تحریر میں پرزے پر لکھ دیتے۔ یہ خیال ہی کس قدر مضطرب کر دینے والا تھا کہ وہ شخص جو کبھی اچھے اچھوں کی بولتی بند کر دیتا تھا، آج خود بولنے سے قاصر ہے۔ یادداشت اب بھی قابل رشک تھی۔ انھیں پرانی سے پرانی بات یاد تھی۔ انھوں نے تمباکو تقریباً ترک کر دی تھی، چوں کہ دانت بالکل نہیں تھے اس لیے دونوں وقت ہوٹل سے 'اڈلی' منگا کر کھا لیتے تھے۔ کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔ دوا لینا ایک عرصہ ہوا بند کر دیا تھا۔

خیری آپا کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ تھی۔ اگر اتفاق سے باہر کہیں نظر آ جاتیں تو پہچاننا مشکل ہوتا۔ گھر کی چھت کھوں ہو گئی تھی اور چھت سے جالے لٹک رہے تھے۔ گھر کا سامان کباڑ کی طرح بکھرا پڑا تھا۔ الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں مگر ان پر دھول جمنے لگی تھی۔ اس کے بعد بھی دو ایک بار ان کی عیادت کے لیے جانے کا اتفاق ہوا۔ آخری ملاقات انتقال سے ایک مہینہ پہلے ہوئی تھی۔ اس قدر لاغر ہو گئے تھے کہ بیڈروم سے ڈرائنگ روم میں سہارا دے کر لانا پڑا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا ہڈیوں پر صرف چمڑا منڑھا ہوا ہے۔ آخر 24 ستمبر 2008 کو صبح ساڑھے نو بجے یعقوب راہی کا فون آیا کہ "باقر صاحب نہیں رہے۔" رحمت آباد (بھگاؤں) کے قبرستان میں ان کی مٹھی بھر ہڈیوں کو دفن کر دیا گیا۔ میت میں وہی گنتی کے چند احباب تھے جن سے ان کے تعلقات بنتے بگڑتے رہتے تھے۔ انھوں نے ایک بار کہا تھا: "میری شاعری کو تجربانی اور تنقید کو Reactionary کہہ کر جھلایا جا سکتا ہے۔ مگر میری شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

علامہ اقبال کی مشہور نظم جبریل و ابلیس میں ابلیس کہتا ہے:

"میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح" باقر صاحب کو بھی ابلیس کی یہی صفت پسند تھی۔ اپنے بارے میں خود کہتے ہیں:

بس مرا ذکر آتے ہی محفل اجڑ گئی
شیطاں کے بعد دوسری شہرت ملی مجھے

وہ ذہنوں میں خوشبو بن کر نہیں دلوں میں خلش بن کر زندہ رہنا چاہتے تھے اور وہ اپنے اس ارادے میں پوری طرح کامیاب رہے۔

♦♦♦

بقیہ: ہندستانی زبان کا مسئلہ

صفحہ ایک سے آگے

ہے۔ جب دور سم الخط اور علیحدہ اردو زبان کا جوکا بھی دو طرف ہے تو پھر ایک زبان کیسے ہو سکتی ہے؟ ایسی عام آسان اردو اور آسان ہندی کہہ کر بھی دیا جا سکتا ہے۔ اتنی زیادہ الجھن پیدا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ یہ کاروائی بالکل بے نتیجہ اور کسی حد تک خطرناک ثابت ہوگی۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ الگ الگ لکھنے والوں کا ذہن بھی الگ الگ ہوتا ہے مثلاً جب عربی کا کوئی فاضل کچھ لکھتا ہے تو اس کی زبان پر عربی کا اور جب سنسکرت کا کوئی ودوان کچھ لکھتا ہے تو اس پر سنسکرت کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً منشی پریم چند اور مولانا نیاز فتح پوری دونوں ہی اردو لکھتے رہے، لیکن دونوں کی زبان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح منشی پریم چند اور بے شنکر پرشاد کی ہندی میں اتنی ہی دوری ہے جتنی منشی جی اور مولانا فتح پوری کی اردو میں، اور اس فرق کو ہم مٹا بھی نہیں سکتے کیوں کہ اس کے مٹانے سے طرز انشا کی ندرت' اور 'شیلی کا انوکھا پن' ختم ہو جائے گا۔

جو صاحب اس کو اور دیکھنا چاہیں وہ مولانا شبلی، سرشار، چکبست، آزاد، خیال، نیاز، راشد الخیری، حسن نظامی، پریم چند اور سدرشن کی طرز انشا کو دیکھیں۔ ٹھیک اسی طرح کا فرق ہندی میں پریم چند، پنڈت بنارسی داس چترویدی، اختر حسین رائے پوری، منشی ظہور بخش ہندی کوی 'مہادیوی ورما' وغیرہ کی 'شیلی' میں موجود ہے۔

اس بحث سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گاندھی جی کے خیال کے مطابق ہم آسان اردو اور آسان ہندی کو 'ہندستانی' کا نام دے سکتے ہیں، لیکن اس سے اصل الجھن نہیں مٹی۔

دوسرا نقطہ جو ہمیں بھولنا نہ چاہیے وہ یہ ہے کہ "اتری ہندستان" کی زبان کو سارے ہندستان کی قومی زبان قرار دینا دوسرے صوبوں کی روایتی اور نفسیاتی خصوصیتوں سے لڑائی مول لینا ہے۔

اس کا سب سے بڑا ثبوت مدراس میں 'ہندستانی' کے خلاف تحریک ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ مدراسیوں کے لیے اتری ہندستان کی زبان اتنی ہی اجنبی ہے جتنی انگریزی۔ دراصل انگریزی سے اجنبیت تو بڑی حد تک مٹ چکی ہے، لیکن ان پر 'ہندستانی' کے نام سے اتری ہندستان کی زبان لادنا ایک اخلاقی ظلم ہے۔ لیکن یہ الجھن آخر کیوں ہے؟ اور کوشش کرنے پر بھی کیوں نہیں مٹتی ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے پرانی تاریخ کے ورق الٹنا اور آزاد خیالی کے ساتھ اس پر سوچ بچار کرنا ضروری ہے۔

ہماری موجودہ حالت اس بیل جیسی ہے جس نے کوشش کر کے رسی کی گرہیں ڈھیلی کر لی ہوں اور آگے بڑھ کر ہری ہری گھاس کھانا چاہتا ہے، لیکن رسی کی سب سے پہلی گرہ مضبوط کھونٹے میں بندھی ہے وہ کوشش کرتا ہے اور تھک کر کھونٹے کے پاس ہی سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ (باقی آئندہ)

بقیہ صفحہ ۴ سے آگے

آیا۔ یعنی اس میں بھی کل 43 امیدواروں میں سے صرف 2 اساتذہ کی تقرری ہو پائی باقی کو باہر کا راستہ دکھا دیا گیا۔ اس طرح دونوں لسٹ ملا کر کل 67 امیدوار سلیکٹ ہوئے اور صرف 3 اساتذہ مقرر کیے گئے۔ مظفر علی خاں کا کہنا ہے کہ جن امیدواروں کو نااہل قرار دیا گیا وہ معمولی سی غلطی بہت باریکی سے نکالی گئی۔ ان امیدواروں میں سے 90 فیصد امیدوار ایسے تھے جو 3-2 سال سے سرکاری اسکولوں میں ٹی جی ٹی اردو کی پوسٹ پر پڑھا رہے ہیں۔ سرٹیفکٹ کے کرائٹیریا میں کوئی کمی نہیں تھی بلکہ جان بوجھ کر ان لوگوں کے ساتھ متعصبانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ ابھی بھی وہاں 45-40 سیٹیں خالی پڑی ہیں۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ جو خاتون تصدیق کر رہی تھیں انھیں اردو آتی ہی نہیں تھی اور ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہے ورنہ ہر سال کوئی نہ کوئی اردو ٹیچر اس کی جانچ کرتا تھا۔ دونوں لسٹ میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ ان میں ایک بھی نام جنرل کیٹیگری کا نہیں تھا۔ اس تعلق سے جب ایجوکیشن آفیسر سے بات کی گئی تو ان کا کہنا تھا کہ اگر کوئی سیٹ خالی رہی تو وہ جنرل کو دے دیں گے۔

بہرحال شمال مشرق کے علاوہ دیگر اضلاع کی حالت تھوڑی بہتر ہے مگر تمام اضلاع میں ایمانداری سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

مولانا آزاد کی نسبت سے یومِ اردو منانے کا فیصلہ مستحسن ہے

انوار الحسن وسطوی (حسن منزل، آشیانہ کالونی، روڈ نمبر ۶، حاجی پور، ویشالی- 844101۔ بہار)

ہفت روزہ 'ہماری زبان' دہلی کے یکم تا ۷ نومبر ۲۰۱۴ء کے شمارے میں جناب اطہر فاروقی جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)، کی تحریر 'یوم اردو کے تعین کا مسئلہ' نظر نواز ہوئی۔ جناب فاروقی نے اپنی تحریر میں 'یوم اردو' کی نسبت مولانا ابوالکلام آزاد سے قائم کرنے کی جو تجویز رکھی ہے اس پر بحث و تمحیص ضرور ہونا چاہیے اور 'یوم اردو' کے سلسلے میں اردو والوں کو بلا تاخیر کسی نتیجے پر پہنچنا چاہیے۔ جب 'یوم ہندی' بغیر کسی اختلاف کے پوری دنیا میں ایک دن منایا جاتا ہے تو 'یوم اردو' منانے میں اختلاف کا ہونا قطعی مناسب نہیں ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد ہندستان میں اردو کی بقا اور تحفظ کے لیے جس شخص نے بے مثال کارنامہ انجام دیا وہ شخصیت ہے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی۔ ۱۹۰۳ء جو انجمن کا سال قیام ہے، اس وقت سے اپنی زندگی کی آخری سانس تک مولانا انجمن کے فروغ کے لیے کوشاں رہے۔ تقسیم ملک کے بعد جب پورے ملک میں فرقہ وارانہ کشیدگی پھیلنے لگی، ہر چہار جانب فساد کے شعلے بھڑک پڑے اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہونے لگا تو انجمن کا صدر دفتر واقع دہلی بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ بلوائیوں نے انجمن کے دفتر کو آگ لگا دی۔ مولانا کو جب اس بربادی کا علم ہوا تو انھوں نے اس کے تحفظ کے لیے ضروری اقدام کیے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ترک وطن کے بعد بہ ظاہر کوئی امید باقی نہیں رہی تھی کہ انجمن کا وجود باقی رہے گا۔ مولانا آزاد نے اس ناگفتہ بہ حالات میں انجمن ترقی اردو کی حفاظت اور اس کی از سر نو تنظیم کی۔ انھوں نے انجمن کے دفتر کو دہلی سے علی گڑھ منتقل کرایا اور ڈاکٹر ذاکر حسین (وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کو اس کا صدر اور قاضی عبدالغفار کو اس کا سکریٹری مقرر کیا۔ ان دونوں حضرات نے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور انجمن ترقی اردو کے وجود کو نہ صرف بچایا بلکہ اس کے فروغ کے لیے کئی اقدام کیے۔ جنوری ۱۹۵۶ء میں جب قاضی عبدالغفار کا انتقال ہو گیا تو ڈاکٹر ذاکر حسین کے مشورے سے پروفیسر آل احمد سرور کو انجمن کا اعزازی سکریٹری مقرر کیا گیا۔ پروفیسر آل احمد سرور کے سکریٹری شپ کے زمانے میں ۱۵ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کے مشورے سے انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے آل انڈیا اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس کا افتتاح وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا اور صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمائی۔ مولانا موصوف نے اس موقع پر حکومت ہند سے اردو کے ساتھ انصاف کرنے کا پُر زور مطالبہ کیا اور اردو والوں کی جانب سے وکالت کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ وہ ہندی کے مخالف نہیں ہیں لیکن 'اردو' بھی اس ملک کی زبان ہے اس لیے اردو کو بھی ہندی کے برابر حق ملنا چاہیے۔ اس کانفرنس کے انعقاد کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو محسن اردو مولانا ابوالکلام آزاد باشندگان وطن کو داغ مفارقت دے گئے۔ بلا خوف و تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مولانا آزاد کی رحلت سے ہندستان میں اردو کاز کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ مولانا کے انتقال سے اردو کو ایک ایسا نقصان پہنچا جس کی تلافی ابھی تک نہ ہو سکی ہے اور نہ مستقبل قریب میں اس کی تلافی کے کوئی آثار نظر آتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو کی بقا اور اس کے تحفظ کے لیے جس تدبّر سے کام لیا اس سے زیادہ کچھ کرنا اُس وقت ممکن نہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب اردو والوں کو 'پاکستانی' اور 'اردو' کو پاکستانی زبان کہا جاتا تھا اور انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لینا ملک دشمنی کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ ایسے حالات میں مولانا ابوالکلام آزاد اردو کے مسیحا کی شکل میں نظر آئے۔ بلاشبہ اردو کے لیے مولانا کی خدمات مثالی ہیں اور کسی طرح بھی ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اگر مولانا کی خدمات کو نظر انداز کرنے کی ذرا بھی کوشش کی گئی تو یہ احسان فراموشی کے مترادف ہوگا۔ لہٰذا راقم السطور جناب اطہر فاروقی کے اس خیال کی پُر زور تائید کرتا ہے کہ 'یوم اردو' کی نسبت مولانا آزاد سے جوڑی جائے، یہ یقیناً احسن و مستحسن فیصلہ ہوگا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو کی بقا اور اس کے تحفظ کے لیے جس تدبر سے کام لیا اس سے زیادہ کچھ کرنا اُس وقت ممکن نہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب اردو والوں کو 'پاکستانی' اور 'اردو' کو پاکستانی زبان کہا جاتا تھا اور انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لینا ملک دشمنی کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ ایسے سنگین حالات میں مولانا ابوالکلام آزاد اردو کے مسیحا کی شکل میں نظر آئے۔ بلاشبہ اردو کے لیے مولانا کی خدمات مثالی ہیں اور کسی طرح بھی ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اگر مولانا کی خدمات کو نظر انداز کرنے کی ذرا بھی کوشش کی گئی تو یہ احسان فراموشی کے مترادف ہوگا۔ لہٰذا راقم السطور جناب اطہر فاروقی کے اس خیال کی پُر زور تائید کرتا ہے کہ 'یوم اردو' کی نسبت مولانا آزاد سے جوڑی جائے، یہ یقیناً احسن و مستحسن فیصلہ ہوگا۔

▫▫▫

'ہماری زبان' کے زر تعاون میں

معمولی اضافہ

کاغذ اور طباعت کی روز افزوں مہنگائی کی وجہ سے کافی عرصے بعد ہفت روزہ 'ہماری زبان' کے زر تعاون میں معمولی اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اب زر سالانہ ۸۵ روپے کے بجائے ۱۲۵ روپے ہوگا اور قیمت فی شمارہ ۳ روپے ہوگی۔

(ادارہ)



یہ تصویر 1993 میں ڈاکٹر اسلم پرویز کے سینٹر فار انڈین لنگویجز کے کمرے میں لی گئی تھی۔ اسلم صاحب اُس وقت وہاں استاد کی حیثیت سے برسر کار تھے اور اطہر فاروقی ان کے طالب علم۔ یہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی ہی میں ممکن تھا کہ استاد اور شاگرد برابر برابر بیٹھ سکیں۔ (یہ تصویر ڈاکٹر محمد جعفر احراری نے عنایت کی ہے)

ادارے کا مضمون نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے — (ادارہ)

مدیر: اطہر فاروقی — Editor: Ather Farouqui
شریک مدیر: محمد عارف خاں — Joint Editor: Mohd. Arif Khan
پرنٹر، پبلشر: شاہد خاں — Printer, Publisher: Shahid Khan
مطبوعہ: ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
Printed at: Samar Offset Printing Press, Delhi
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایوینیو، نئی دہلی- ۱۱۰۰۰۲
Proprietor: Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue, New Delhi-110002
قیمت (فی شمارہ): تین روپے، سالانہ: ۱۲۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Subscription: (Per Issue): Rs. 3/-, Yearly: 125/-
(Foreign Countries: US $ 8)
http://www.atuh.org. Phones: 23237212, 23237214